بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اشارات

کسی بات کے جواب میں دو قسم کے طرزِ عمل تو آسانی سے سمجھ میں آجاتے ہیں، ایک ان لوگوں کا طرزِ عمل جو اسکو صاف طور پر رد کردیں، دوسرا اُن لوگوں کا جو اسے سیدھی طرح قبول کریں، لیکن ان دونوں کے درمیان ایک اور طرزِ عمل ہے جسکو سمجھنا اور جس سے عہدہ برآ ہونا سخت مشکل ہوتا ہے، اور وہ ان لوگوں کا طرزِ عمل ہے جو اُس بات کے حق ہونے سے انکار بھی نہیں کرتے اور پھر اسکو قبول کرنیکے لیے تیار بھی نہیں ہوتے۔ یہ حضرات عموماً اس طرح کلام کی ابتدا کرتے ہیں کہ "تم جو کہتے ہو حق تو وہی ہے مگر۔۔۔"۔ اور یہ مگر اتنا بڑا ہوتا ہے کہ اُس پورے حق کو نگل جاتا ہے جس کا اعتراف پہلے فقرے میں کیا گیا تھا۔

اصل بات یہ ہے کہ حاضر کے ساتھ ان لوگوں کی وابستگی، اور عاجلہ سے اِن کی دلچسپی اتنی بڑھی ہوئی ہوتی ہے کہ یہ کسی طرح اس سے اپنا تعلق توڑ نہیں سکتے۔ جو کچھ اب تک کرتے رہے ہیں وہی کیے جانا چاہتے ہیں۔ لیکن عقل اور ضمیر کی گواہی سے بالکل انکار کردینے کی جرأت بھی ان میں نہیں ہوتی۔ جب حق بالکل بے نقاب ہوکر سامنے ہی آن کھڑا ہو تو بھلا جانتے بوجھتے یہ برملا کیسے کہہ دیں کہ یہ حق نہیں ہے۔ لہٰذا بچاؤ کی صورت اُنہیں بس یہی نظر آتی ہے کہ ایک طرف حق کا اعتراف کریں اور دوسری طرف اُس سے گریز کرنے کے لیے دلائل و شواہد کے لشکر کے لشکر جمع کرنے کی کوشش کریں تاکہ حق کے خلاف چلنے میں ان کو برسرِ حق مان لیا جائے۔ کس قدر عجیب ہے یہ مقام! ایسے ہی لوگوں کو خطاب کرکے قرآن نے کہا تھا کہ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ؟

"حق کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا رہ جاتا ہے"۔ اللہ کے بندو! جب تم خود مانتے ہو کہ حق یہ ہے تو اسے چھوڑ کر جس چیز پر بھی تم چلو گے وہ باطل ہی ہو گی۔

پچھلے دنوں جن کثیر التعداد لوگوں سے بالمشافہ یا بالمراسلہ تبادلۂ خیال کا اتفاق ہوا اُن میں بعض اصحاب پہلی قسم کے تھے جنہوں نے بلا پس و پیش، یا بہت تھوڑی گفتگو کے بعد حق کو حق اور ضلال کو ضلال تسلیم کر لیا اور غلط راستوں کو چھوڑ کر راہِ راست پر چلنے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ ان سے کچھ کم تعداد میں دوسری قسم کے آدمی ملے جنہوں نے صاف طور پر کہدیا کہ یہ حق نہیں ہے، یا یہ کہ ہم اسکی تائید نہیں کر سکتے۔ لیکن مراسلہ نگاروں میں بھی اور بالمشافہ گفتگو کرنے والوں میں بھی بکثرت لوگ وہ نکلے جو قسم ثالث سے تعلق رکھتے تھے۔ ان سب میں اتنی بات تو مشترک ہے کہ ایک سانس میں جس چیز کو صحیح تسلیم کرتے ہیں دوسرے سانس میں اسی کی تردید شروع کر دیتے ہیں، مگر اس کے بعد ہر ایک کا انداز گریز جدا ہے اور ہر ایک کے دلائلِ گریز مختلف۔ سچ یہ ہے کہ پہلے اس بات کا پورا اندازہ تھا ہی نہیں کہ حق سے بھاگنے کے راستے اتنے بے شمار ہیں۔ اور کمال یہ ہے کہ اکثر حضرات نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ خود اپنے راہِ حق سے فرار کو عین حق ثابت کرتے، بلکہ اسکی بھی کوشش کی کہ جو کم بخت صحیح اور غلط کو صاف الگ الگ دیکھ رہا ہے وہ بھی اپنی آنکھیں بند کرے اور اندھوں کی ٹولی میں آشامل ہو، جو غریب صراطِ مستقیم پر چلنے کا ارادہ رکھتا ہے وہ بھی کسی طرح بہکے اور انہی پگ ڈنڈیوں پر چل پڑے جن میں وہ خود بھٹک رہے ہیں۔ اسلام کا درد بھی دل میں بہت ہے۔ یہ بھی چاہتے ہیں کہ اللہ کا بول بالا ہو۔ یہ بھی مانتے ہیں کہ اسلامی تحریک کا اصل راستہ وہی ہے جو اِن صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے اور انبیاء علیہم السلام نے اسی ڈھنگ پر کام کیا ہے۔ مگر اللہ کے بندے ہزاروں قسم کی دنیوی و غیر دینی مصلحتوں کو حجت بنا کر نہ صرف آپ شاہراہِ مستقیم سے روگردانی کرتے ہیں بلکہ اس کا اہتمام بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ کوئی اس پر چلنے نہ

پائے۔ ایسی ہی کچھ صورت ہوگی جب اہل کتاب سے کہا گیا ہوگا کہ یٰاَھْلَ الْکِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَھَا عِوَجًا وَّ اَنْتُمْ شُھَدَآءُ۔

عجیب تر بات جو مشاہدہ میں آئی وہ یہ ہے کہ دینِ حق کا صحیح مفہوم اور اسے قائم کرنے کا انبیائی طریقِ کار جب اُن لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا جنکو کمیونسٹ، دہریہ اور ملحد کہا جاتا ہے تو اُس نے ان میں سے بہتوں کو اپیل کیا اور اِس کے مقابلہ میں اُنکے تمام ہتھیار کند ہو گئے۔ حتی کہ ذی فہم غیر مسلموں تک کو ہم نے دیکھا کہ یہ چیز جب انکے آگے رکھی گئی تو وہ اپنے ان تمام تصورات پر نظرِ ثانی کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے جو اسلام اور مسلم کے متعلق اُنکے ذہن میں جاگزیں تھے۔ لیکن اس چیز کے لیے دلوں کے دروازے اگر کہیں بند پائے گئے تو صرف اس جگہ جہاں رات دن دین و ملت، دین و ملت کی تسبیح پڑھی جاتی ہے۔ یہ ماجرا دیکھ کر پہلے تو حیرت ہوئی، مگر جب غور کیا تو اسکی وجہ یہ سمجھ میں آئی کہ اس وقت دراصل اسلام کے حقیقی مقتضیات، اور مسلمانوں کے دنیوی مفاد اور تاریخی تعصبات کے درمیان پورا تعارض واقع ہو چکا ہے۔ اسلام بحیثیت ایک اصولی تحریک کے ایک راستہ کا تقاضا کرتا ہے اور مسلمانوں کے دنیوی مفاد اور تاریخی تعصبات ایک دوسرا طرزِ عمل چاہتے ہیں۔ یہ دونوں متضاد چیزیں اُس وقت تک خلط ملط رہتی ہیں جب تک اسلام کو اسکی اصلی اور اصولی نوعیت میں برسرِ کار نہیں لایا جاتا، کیونکہ اس صورت میں لوگوں کے لیے یہ موقع رہتا ہے کہ سارا کام تو اُس طرز پر کرتے رہیں جو انکے قوم پرستانہ مقاصد اور تعصبات کے لیے موزوں ہے اور دین و ملت کے نام کو صرف اس لیے استعمال کریں کہ جذبات کو حرکت میں لانے اور مفاد قومی کے گرد "جمعیتِ اسلامیہ" کو مجتمع کرنے کا یہی ایک ذریعہ ہے۔ مگر جب اسلام کو ایک تحریک کی حیثیت سے سامنے لے آیا جائے اور صاف صاف بتا دیا جائے کہ اس تحریک کا فطری اور منطقی راستہ کیا

بجالانا سب سے پہلے ضروری ہے۔ اس کے حل سے استفادہ کرنے کے لیے کوئی شخص اسکی جماعت میں تبدیل مذہب کے بغیر داخل نہیں ہوسکتا۔ پھر یہ کیسے امید کی جاسکتی ہے کہ لوگ اسلام کو اُس آسانی کے ساتھ قبول کرسکینگے جسکے ساتھ وہ دوسری تحریکوں کو قبول کرتے ہیں؟

یہ شبہ بہت لوگوں کے دلوں میں ہے اور بظاہر بڑا قوی نظر آتا ہے۔ مگر فی الحقیقت نہایت کمزور ہے اور میں اس کو کوئی وزن نہیں دیتا۔ واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی اجتماعی نظریہ اور مسلک بھی ایسا نہیں ہے جو اپنے کچھ اعتقادات نہ رکھتا ہو اور جسکا ایک مخصوص فلسفہ نہ ہو۔ چند امور مابعد الطبیعت Metaphysical problems) ایسے ہیں جنکے متعلق سلبی یا ایجابی حیثیت سے ایک نہ ایک رائے قائم کرنا بہرحال ہر اس مسلک کے لیے ناگزیر ہے جو انسان کے لیے ایک لائحۂ زندگی بناتا ہو۔ یہ سوالات کہ کائنات کا یہ نظام کس نوعیت کا ہے؟ اور اس نظام میں انسان کی کیا حیثیت ہے؟ اور انسان کی زندگی کا مآل کیا ہے؟ اور یہ کہ دنیا میں سب کچھ تو انسان کے لیے ہے مگر انسان خود کس لیے ہے؟ یہ دراصل زندگی کے بنیادی سوالات ہیں جن کا ایک قابلِ عمل حل Workable Solution) پیش کیے بغیر کوئی ذہنی، اخلاقی، تعلیمی اور تمدنی نظام بنایا ہی نہیں جاسکتا۔ اور کسی نظام کے بھی محض عملی پہلوؤں کو لے کر آدمی کام نہیں کرسکتا جب تک کہ ساتھ ساتھ اسکے بنیادی فلسفہ، یا بالفاظ دیگر اسکے اعتقادات کو بھی قبول نہ کرلے۔ پس ایک اعتقادی نظام ہونا تنہا اسلام ہی کی کوئی انوکھی خصوصیت نہیں ہے۔ اس جہت سے اگر اسلام کی راہ میں کوئی مشکل حائل ہے تو ایسی مشکل ہر اجتماعی مسلک کی راہ میں حائل ہے۔ ہر اجتماعی مسلک فی الواقع ایک مذہب ہی ہے اور جو بھی اسکی پیروی اختیار کرتا ہے وہ حقیقت میں ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرتا ہے خواہ اپنی سادہ لوحی کی بنا پر یہ کہتا اور سمجھتا ہے کہ بدستور اپنے پہلے مذہب پر ہوں۔

میں ایک سیدھی سی مثال سے اس نکتہ کی مزید توضیح کرونگا۔ یہ کمیونزم آپکے سامنے ہے۔ اسی کو مثال میں لے لیجیے۔ اگر اسلام اس مابعد الطبیعی نظریہ سے اپنے مسلک کی ابتدا کرتا ہے کہ خدا ہے، تو کمیونزم اس نظریہ سے چلتا ہے کہ خدا نہیں ہے یا کم از کم یہ کہ اس کا وجود و عدم وجود ہمارے لیے خارج از بحث ہے۔ اگر اسلام یہ نقطۂ نظر اختیار کرتا ہے کہ یہ دنیا خدا کی سلطنت ہے اور انسان یہاں اُس کا تابع امر ہے تو کمیونزم یہ نقطۂ نظر اختیار کرتا ہے کہ دنیا ایک اتفاقی بساط ہے اور انسان یہاں مطلقاً خود مختار (Independent) ہے اگر اسلام یہ پہلو لیتا ہے کہ انسان کو یہاں کام کرنے کے لیے خدا کی ہدایت درکار ہے اور وہ وحی کے ذریعہ سے آتی ہے تو کمیونزم یہ پہلو لیتا ہے کہ کوئی ہدایت درکار نہیں ہے اور وحی نہیں آتی۔ اگر اسلام اس مقام سے سلوک کا آغاز کرتا ہے کہ اس زندگی کے بعد ایک اور زندگی ہے جس میں انسان کو اپنی موجودہ زندگی کے پورے کارنامے کا حساب دینا ہے تو کمیونزم اس مقام سے چلتا ہے کہ جو کچھ ہے یہی زندگی ہے اور بعد میں نہ زندگی ہے نہ حساب کتاب۔ کیا یہ دونوں یکساں مابعد الطبیعی نظریے نہیں ہیں؟ پھر اگر سائنٹفک ثبوت کے بغیر محض استدلال اور عقلی شہادت کی بنا پر بہت سے وہ لوگ جو کل تک کمیونسٹ نہ تھے، آج کمیونزم کے نقطۂ نظر کو قبول کر سکتے ہیں تو آخر انہی دو بنیادوں پر بہت سے وہ لوگ جو آج مسلم نہیں ہیں، کل اسلام کا نقطۂ نظر کیوں قبول نہیں کر سکتے؟

اسی طرح ایک ہادی پر ایمان لانے کا معاملہ بھی دونوں میں مشترک ہے۔ اگر مسلم ہونے کے لیے محمدؐ رسول اللہ پر ایمان لانا پڑتا ہے تو کمیونسٹ بھی آخر مارکس پر ایمان لاتا ہی ہے۔ پھر اگر ایک شخص جو کل تک مارکسی نہ تھا، آج مارکس کی تعلیمات کو دیکھ کر اس کو اپنا رہنما تسلیم کر سکتا ہے، تو آخر کونسی چیز مانع ہے کہ ایک وہ شخص جو کل تک مسلم نہ تھا، آج محمدؐ رسول اللہ کی زندگی، انکی تعلیمات

اور انکے کارنامے کو دیکھ کر انکو اپنا ہادی و رہبر نہ تسلیم کرے؟

ایسا ہی معاملہ جماعتی ضوابط (Party-discipline) کا بھی ہے۔ اگر اسلام اُن لوگوں کو جو اسکی جماعت میں شامل ہوں، اپنے کچھ ضوابط کا پابند بناتا ہے تو کیا کمیونسٹ پارٹی ان لوگوں کو جو اس میں شامل ہوں کسی ضابطہ اور کسی قاعدے میں نہیں جکڑتی؟ پھر جب بہت سے انسان کمیونزم کے اصولوں پر ایمان لانے کے بعد کمیونسٹ پارٹی کے ضوابط کی پابندی قبول کر لیتے ہیں تو آخر اسلام ہی کے جماعتی ضوابط میں کونسا ہوّا چھپا ہوا ہے کہ جو لوگ اسلام کے اصولوں کو جانچ کر ان پر ایمان لانے کے لیے تیار ہونگے انکو یہ ہوّا اپنی صورت دکھا کر بھگا دیگا؟

اس مثال سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اسلام میں خدا کی ہستی اور اسکی توحید کا اعتقاد یا آخرت کا اعتقاد، یا پیغمبر کی ناقابل منازعت پیشوائی (Indisputable leadership) اور قرآن کے آخری منبع قانون ہونے کا اعتقاد شرطِ لازم ہونا، اور نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے ضوابط کی پابندی فرض ہونا، ہرگز کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اس کے پھیلنے اور غیر مسلموں کے اسکی طرف کھنچ کر آنے میں سدِ راہ ہو۔ مابعد الطبیعی اعتقادات اور جماعتی ضوابط دوسرے مسلکوں میں بھی موجود ہیں، اور جو انسان ان مسلکوں میں اپنی زندگی کے مسائل کا حل اپنی سمجھ کے مطابق صحیح پاتے ہیں وہ ان کے عقائد اور ضوابط، دونوں کو قبول کرتے ہی ہیں، پھر کوئی وجہ نہیں اگر اسلام ان کے سامنے تمام مسائل زندگی کا بہترین حل پیش کرے، اور انکی اپنی فلاح و سعادت کا راستہ کھول کر سامنے رکھ دے تو عقائد اور ضوابط کی شرط صرف اسلام ہی کے معاملہ میں ان کے لیے رکاوٹ ثابت ہو۔

البتہ اسلام کی راہ میں ایک عظیم الشان رکاوٹ ضرور حائل ہے اور اصلی رکاوٹ وہی ہے،

اور اس رکاوٹ کی ذمہ داری اسلام پر نہیں بلکہ اسکے پیروؤں پر ہے۔ اس واقعہ سے کون انکار کرسکتا ہے کہ ہندوستان کو اصلی اور خالص اسلامی حکومت، اسلامی اخلاق، اور اسلامی نظام تمدن سے لذت آشنا ہونے کا کبھی موقع ملا ہی نہیں۔ پچھلی صدیوں میں مسلمان بادشاہوں نے، مسلمان امراء نے، مسلمان حکام اور اہل کاروں اور سپاہیوں نے، مسلمان زمینداروں اور رئیسوں نے، اور مسلمان عوام نے اپنے برتاؤ سے اسلام کا جو نمونہ پیش کیا وہ ہرگز ایسا نہ تھا کہ اس ملک کے عام باشندوں کو اسلام کا گرویدہ بنا سکتا۔ بلکہ اسکے برعکس نفسانی اغراض کے لیے جو کشمکش انکے اور غیر مسلم عناصر کے درمیان مدتہائے دراز تک برپا ہوتی رہی اُس نے اسلام کے خلاف مستقل تاریخی تعصبات پیدا کردیے۔ اس تاریخی پس منظر کے ساتھ اسلام کا جو نمونہ آج اس زمانہ میں مسلمان اپنی انفرادی زندگی، اور جماعتی طریق کار سے پیش کر رہے ہیں وہ بھی کچھ ایسا خوبصورت نہیں ہے کہ اس قسم کے نمونے کو دیکھ کر لوگ اُس تحریک کے عاشق ہو جائیں جسکی نمائندگی اس شان سے کی جا رہی ہو۔ خود ہی انصاف سے دیکھ لیجیے کہ انفرادی زندگی میں ایک عام مسلمان ایک عام غیر مسلم سے آخر کس چیز میں برتر نظر آتا ہے کہ لوگ اُس برتری کے منبع کی جستجو کریں؟ اس کے برتاؤ میں، اسکے اخلاق میں، اسکے معاملات میں کہاں کوئی خفیف سی چمک بھی ایسی نمودار ہوتی ہے جس سے یہ ظاہر ہو کہ یہ شخص فائق تر اور پاکیزہ تر اصولوں کا پیرو ہے؟ کیا ایک مسلمان زمیندار یا "شریف" کی نخوت اصطلاحی "کمینوں" کے مقابلہ میں اپنے طبقہ کے کسی غیر مسلم "شریف" یا رئیس سے کچھ کم ہے؟ کیا ایک مسلمان تاجر یا پیشہ ور آدمی اپنے ہم پیشہ غیر مسلم سے کچھ زیادہ متدین ہوتا ہے؟ کیا ایک مسلمان حاکم یا عہدہ دار اپنے اختیارات کے استعمال میں کسی غیر مسلم ہم سر سے کچھ بہتر اخلاقی اصولوں کی پیروی کرتا ہے؟ کیا دفتروں کے مسلمان ملازم رات دن انہی تمام ذلیل طریقوں کی پیروی نہیں کر رہے ہیں جنکی پیروی انکے غیر مسلم ساتھی کرتے ہیں؟ کیا وہی جائز و ناجائز طریقوں سے اپنی

قوم کا تعصب، وہی کمینہ چالوں سے غیر قوم والوں کو نقصان پہنچانے کی کوششیں کرنا، اور وہی چھوٹی چھوٹی دنیوی اغراض کے پیچھے لڑے مرنا، جنکی شکایت یہ غیر مسلموں سے کرتے ہیں، خود ان کا بھی رات دن کا مشغلہ نہیں ہے؟ پھر جب ایک غیر مسلم اسلام کے ان نمائندوں کی زندگی میں کہیں بھی کوئی فوقیت کا نشان نہیں پاتا، جب وہ انہیں بھی وہی سب کچھ کرتے دیکھتا ہے جو وہ خود کرتا ہے، اور جب وہ انہیں بھی اپنی مقاصد کے لیے لڑتے جھگڑتے، اور کشمکش کرتے دیکھتا ہے جنکے لیے وہ خود لڑتا جھگڑتا اور کشمکش کرتا ہے، تو آخر کونسی چیز اسکو اُس مسلک کی طرف مائل کر سکتی ہے جس کی نمائندگی یہ لوگ کر رہے ہیں۔ بلکہ جب ایک ہی نفسانیت اور دنیا پرستی کے میدان میں وہ اور یہ برابر کے حریف ہیں تو اپنے حریفوں کے مسلک پر وہ کھلے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہی کیوں محسوس کرنے لگا؟ ایک طرف پچھلے تاریخی تعصبات اور پھر آج کی نفسانی کشمکش، کیا یہ دونوں چیزیں اسکے دل کے دروازوں پر قفل چڑھا دینے کے لیے کافی نہیں؟

انفرادی زندگی سے وسیع تر، قومی زندگی کے دائرے میں مسلمان اس وقت تک جس پالیسی پر چلتے رہے ہیں، اور آج جس پالیسی پر مُصر ہیں، بلکہ جسے اپنی حیات اجتماعی کا ضامن سمجھ رہے ہیں وہ کیا ہے؟ اصول اسلام اور مقاصد اسلام کا کہیں نام تک نہیں آتا۔ کسی خطبے، کسی تقریر یا کسی ریزولیوشن میں آپ ایک فقرہ ایسا نہیں پا سکتے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ یہ لوگ اپنی اغراض اور اپنے دنیوی مقاصد کے لیے نہیں بلکہ انسانوں کی فلاح کے لیے عالمگیر کلّی اصول لیکر اٹھے ہیں اور انکی لڑائی محض اصول حق کی خاطر ہے۔ اسکے برعکس آپ یہ دیکھینگے کہ ان کے اور دوسری قوموں کے درمیان بالکل برابر کی قوم پرستانہ جنگ برپا ہے، دونوں ایک سطح پر اتر آئے ہیں، ایک ہی مرتبہ کی دنیوی اغراض کے لیے کشمکش کر رہے ہیں، ایک ہی قسم کی چالیں (tactics)، زبان، اصطلاحات

اور اصولِ نزاع اختیار کر رہے ہیں، اور سارا رونا دھونا اور لڑائی جھگڑا انہی چیزوں کے لیے ہے جنکے لیے ان کے حریفوں کا رونا دھونا اور لڑائی جھگڑا ہے۔ پھر کس طرح یہ بات عقل میں آسکتی ہے کہ جن لوگوں سے آپ دنیوی اغراض کے لیے مساوی مرتبہ پر لڑ رہے ہوں، جن سے آپ رقابت اور حریفی کا پرانا اور تازہ رشتہ رکھتے ہوں، جنکے ساتھ آپکی سیاسی اور معاشی مفادات کے لیے کشمکش برپا ہو، وہ آپ کی طرف سے کسی اصولی تحریک کی دعوت پر اسی طرح کھلے دل سے غور کرنے کے لیے تیار ہونگے جس طرح وہ اشتراکیت یا ڈیموکریسی یا کسی اور مسلک کی دعوت کے لیے تیار ہوتے ہیں؟

اس مرحلہ پر پہنچ کر ایک اور شبہ سامنے آتا ہے اور آگے بڑھنے سے پہلے اس کا صاف ہوجانا ضروری ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آخر جہاد میں بھی تو غیر مسلموں سے کشمکش اور مقاتلہ ہوتا ہے۔ اگر یہ چیز نفسیاتی اعتبار سے اسلامی تحریک کے پھیلنے میں مانع ہے تو ماننا پڑیگا کہ جہاد بھی اسلام کی راہ میں معاون ہونے کے بجائے سدِ راہ ہوتا ہے۔ پھر کیا اللہ تعالیٰ انسانی نفسیات سے بے خبر تھا کہ اس نے اپنے دین میں وہ چیز رکھی جو لوگوں کو قبول ہدایت سے روکتی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جہاد کی نوعیت نفسانی نزاع و مقاتلہ سے بالکل مختلف ہے، اسلیے اسکے اثرات و نتائج بھی اُس جنگ اور کشمکش کے اثرات و نتائج سے مختلف ہیں جو نفسانی اغراض کے لیے کی جائے۔ ایک لڑائی وہ ہے جو آپ کے اور دوسرے شخص کے درمیان اپنے دنیوی مفاد کی خاطر ہو، اور دوسری لڑائی وہ ہے جو آپ اُس سے خود اُسی کے مفاد کی خاطر، اُسکی اپنی فلاح کی غرض سے لڑیں۔ ایک لڑائی اس بنیاد پر ہے کہ آپ کی اور اسکی ذاتی یا قومی اغراض متصادم ہیں اور دونوں اپنی اپنی اغراض کے لیے لڑ رہے ہیں۔ اور دوسری لڑائی اس بنیاد پر ہے کہ آپ ایک شخص کو جو ناواقفیت

کی وجہ سے تباہی کے راستے پر جا رہا ہے، بچانا چاہتے ہیں اور اس لیے لڑتے ہیں کہ تو اپنے آپ کو تباہ نہ کر۔ کیا یہ دونوں لڑائیاں یکساں ہیں اور دونوں کے نتائج مساوی ہو سکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ پہلی قسم کی لڑائی میں دونوں کے درمیان یا نفرت و عداوت بڑھیگی یا مصالحت بھی ہوئی تو منافقانہ اور خود غرضانہ ہوگی۔ یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں ہے کہ کبھی ایک فریق دوسرے فریق کی دنیوی اغراض پر ایمان لاکر اس کا ولی حمیم بن جائے، کیونکہ ایک شخص یا قوم کی دنیوی اغراض وہ چیز ہیں ہی نہیں جن پر دوسرے شخص یا قوم کے ایمان لانے کا تصور بھی کیا جا سکتا ہو۔ بخلاف اسکے دوسری قسم کی لڑائی میں اول اول تو فریق مقابل آپ پر یہ شبہ کریگا کہ شائد اندر کوئی چھپی ہوئی غرض ہوگی اور جب تک یہ شبہ رہیگا وہ آپ سے لڑتا بھی رہیگا، مگر جب آپکے طرزِ عمل سے اُس پر ثابت ہو جائیگا کہ واقعی میرا حریف میرا دشمن نہیں ہے بلکہ سچا خیر خواہ ہے اور اپنے بھلے کے لیے نہیں بلکہ میرے ہی بھلے کے لیے لڑ رہا ہے، تو عین لڑائی کے دوران میں اسکے دل کی کایا پلٹ ہو جائیگی اور وہ آپکا دشمن بننے کے بجائے آپ کا عاشق بن جائیگا۔ پھر ایک دوسرا عظیم الشان فرق دونوں لڑائیوں میں یہ ہے کہ دنیوی اغراض کی جنگ میں تو آپکی لڑائی اُس پوری قوم سے ہوگی جسکی اغراض سے آپکی اغراض متصادم ہیں، حتیٰ کہ اسکا ایک ایک فرد آپ کی قوم کے ایک ایک فرد کا حریف مقابل بن جائیگا۔ مگر دوسری قسم کی لڑائی جو محض اصولِ حق کی خاطر لڑی جائے اُس میں ڈٹ کر آپکا مقابلہ صرف وہ لوگ کرینگے جو پیشوائی اور خدائی کی گدیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں یا ظالمانہ طریقوں سے ناجائز فائدے اٹھا رہے ہیں۔ رہے عوام تو وہ صرف اس وقت تک لڑینگے جب تک اُن پر ائمۂ کفر کی ساحری کا طلسم قائم رہیگا۔ اور جونہی اُن پر یہ منکشف ہوا کہ آپ کی لڑائی تو ظالموں کے ظلم کا خاتمہ کرنے اور انکے پھندے کاٹنے کے لیے ہے اور اس لڑائی میں اُن کا مفاد نفس پرست پیشواؤں، جابر بادشاہوں اور رئیسوں، اور مردم خور سرمایہ داروں کے مفاد کی عین ضد ہے، تو فوج در فوج وہ آپ کی طرف ٹوٹ

کر آئینگے اور میدان میں وہ سرداران کفر و بغی تنہا رہ جائینگے جو مغلوب و مقہور ہوئے بغیر کم ہی راہِ راست پر آتے ہیں - یہی صورت ابتدائے اسلام میں عرب، ایران اور شام میں پیش آئی تھی -

پس یہ گمان کرنا کہ نفس کشمکش اور نفس مقاتلہ کسی تحریک کے پھیلنے میں سدِ راہ ہوتا ہے، بالکل غلط ہے - اسکے سدِ راہ ہونے اور معاون راہ بننے کا انحصار بالکلیہ آپکے مقاصد جنگ پر ہے - آپ اپنے لیے لڑینگے تو اُس تحریک کے لیے پیش قدمی کے تمام راستے بند کر دینگے جسکے آپ نمائندہ سمجھے جاتے ہیں - اور اگر بے لاگ اور خالص نیت کے ساتھ محض اپنی تحریک کے اصولوں کے لیے لڑینگے تو آپ کی لڑائی مجرب عملِ تسخیر ثابت ہوگی -

---

اب اصل مبحث کی طرف پھر رجوع کیجیے - اسلامی تحریک کی راہ میں ایک کانٹا تو یہ ہے جسکا اوپر ذکر ہوا - اور دوسرا کانٹا وہ جامد اور بے روح مذہبیت ہے جسکو آج کل اصل اسلام سمجھا جا رہا ہے - اس غلط مذہبیت کا پہلا بنیادی نقص یہ ہے کہ اس میں اسلام کے عقائد اور عبادات کا کوئی ربط اجتماعی نظام اور کاروبارِ حیاتِ دنیا سے قائم نہیں رہا ہے - اسلام کے عقائد محض ایک دھرم (Religion) کے مزعومات ( ) بنا کر رکھ دیے گئے ہیں، حالانکہ وہ ایک مکمل فلسفۂ اجتماعی اور نظام تمدن کی منطقی بنیاد ہیں - اور اسی طرح اسکی عبادات محض پوجا پاٹ بنا کر رکھ دی گئی ہیں، حالانکہ وہ اُن ذہنی اور اخلاقی بنیادوں کو مضبوط و مستحکم کرنے کے وسائل ہیں جن پر اسلام نے اپنا نظام اجتماعی تعمیر کیا ہے - اس عملِ تحریف کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں کی سمجھ میں کسی طرح یہ بات نہیں آتی کہ آخر ایک سیاسی، معاشی اور تمدنی لائحۂ عمل کو چلانے کے لیے اِن عقائد اور عبادات کی ضرورت ہی کیا ہے - دوسرا بنیادی نقص اس مسخ شدہ مذہبیت میں یہ ہے کہ اس میں اجتہاد کا دروازہ بند ہے جسکی وجہ سے اسلام ایک زندہ تحریک کے بجائے محض عہدِ گذشتہ کی ایک تاریخی تحریک بن کر رہ گیا ہے

اور اسلام کی تعلیم دینے والی درسگاہیں آثار قدیمہ کے محافظ خانوں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اجنبی لوگ اس چیز کو دیکھ کر زیادہ سے زیادہ تاریخی ذوق کی بنا پر اظہار قدر شناسی تو کر سکتے ہیں مگر یہ توقع ان سے نہیں کی جا سکتی کہ وہ حال کی تدبیر اور مستقبل کی تعمیر کے لیے اُس سے ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت محسوس کریں گے۔ تیسرا اہم نقص اس میں یہ ہے کہ جزئیات کی ناپ تول، مقداروں کے غیر منصوص تعین، اور روح سے بڑھ کر مظاہر پر مدارِ دین داری رکھنے کی بیماری اس میں حد سے بڑھ گئی ہے، اور وہ غیروں کی تالیف تو کیا کریگی اُلٹی اپنوں کی تنفیر کا سبب بن رہی ہے۔ اس غلط مذہبیت کے علمبرداروں کی زندگی دیکھ کر اور اُنکی باتیں سن کر آدمی اس سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ انسان کی ابدی فلاح و خسران کا مدار کیا انہی چھوٹی چھوٹی چیزوں پر ہے جن پر یہ لوگ اتنا زور دیتے ہیں؟

یہ ہیں وہ اصلی رکاوٹیں جو اسلام کو بحیثیت ایک تحریک کے اٹھنے اور پھیلنے سے روک رہی ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ لوگ ان رکاوٹوں کا تجزیہ کر کے انکی حقیقی نوعیت و کیفیت کو سمجھنے اور انہیں دور کرنے کی فکر نہیں کرتے، بلکہ محض سرسری نظر میں یہ دیکھ کر کہ اسلام کی راہ میں شدید رکاوٹیں حائل ہیں، ان سے خوف زدہ ہو جاتے ہیں، اور پھر ان سے بچ کر اسلام کی "خدمت" کرنے کے لیے عجیب عجیب نئے راستے نکالتے ہیں۔ مثلاً:

ایک راستہ بعض لوگوں نے یہ تجویز کیا ہے، اور وہ اس پر بڑی سنجیدگی سے گفتگو کرتے ہیں کہ اسلام کے مجموعی نظام میں سے محض اسکے معاشی و سیاسی اصولوں کو لے لیا جائے اور انہی کی بنیاد پر ایک پارٹی ایسی بنائی جائے جس میں شامل ہونے کے لیے توحید، آخرت، قرآن، رسالت، کسی چیز پر بھی ایمان لانے کی ضرورت نہ ہو اور نہ عبادات کی بجا آوری اور احکام شرعیہ کی پابندی ضروری ہو۔ حالانکہ یہ بدترین اور غیر معقول ترین تجویز ہے جس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ کوئی صاحب نظر آدمی ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خیال

نہیں کر سکتا کہ کسی اجتماعی نظریہ اور لائحۂ عمل کو اُسکے بنیادی فلسفے، اُسکے نظامِ اخلاق اور اسکے تعمیر سیرت کرنیوالے ارکان سے الگ کر کے چلایا جا سکتا ہے۔ اللہ کی حاکمیت کا تصور نکال دینے کے بعد اسلام کا نظام سیاسی آخر ہے کس چیز کا نام؟ اور اگر قرآن کو ماخذِ قانون اور محمد رسول اللہ کو رعیت (انسان) اور بادشاہ (اللہ) کے درمیان نزولِ احکام کا واحد مستند ذریعہ نہ مانا جائے تو کیا اسلامی اسٹیٹ کی تعمیر ہوا پر کی جائیگی؟ پھر وہ کونسا نظامِ تمدن و سیاست ہے جو کسی نظامِ اخلاق کا سہارا لیے بغیر قائم ہو سکتا ہے؟ اور کیا اللہ کے سامنے انسان کی ذمہ داری و جواب دہی کا تخیل نکال دینے کے بعد اس نظامِ تمدن و سیاست کے لیے کوئی اخلاقی سہارا باقی رہ جاتا ہے جس کا نقشہ اسلام نے پیش کیا ہے؟ کیا اس نظام کو آپ مادہ پرستانہ اخلاقیات کے بل پر ایک دن کے لیے بھی قائم کر سکتے ہیں؟ پھر وہ خاص قسم کی انفرادی سیرت اور جماعتی زندگی جو اس نظامِ تمدن و سیاست کے لیے درکار ہے نماز، روزہ اور حج و زکوٰۃ کے سوا اور کس ذریعہ سے پیدا ہو سکتی ہے؟ اور وہ نہ ہو تو یہ نظام چل کہاں سکتا ہے؟ پس یہ غایت درجہ کا افلاسِ فکر ہے کہ کوئی شخص محض شاخوں کا حُسن دیکھ کر کہنے لگے کہ آؤ جڑ کے بغیر ان شاخوں ہی سے درخت قائم کریں۔

دوسری راہ فرار جو اپنی رکاوٹوں کی صعوبت سے مرعوب ہو کر بعض لوگوں نے نکالی ہے، وہ یہ ہے کہ پہلے ہندوستان کو انگریزی امپیریلزم سے آزاد کرا کے یہاں جمہوری حکومت قائم کرنے پر سارا زور صرف کیا جائے، پھر اُس جمہوری نظام میں بتدریج اسلامی طرز کا انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی جائے۔

شکست خوردگی کا برا ہو۔ یہ آدمی کے دماغ کو کس بری طرح مختل کر دیتی ہے۔ اس تجویز کو ذرا تحلیل کر کے تو دیکھیے کہ نتیجہ کیا برآمد ہوتا ہے۔ اسلامی طرز کا انقلاب جو آپ آخر کار برپا کرنا چاہتے ہیں اُس کا ماحصل تو یہی ہے نا کہ مالک الملک اللہ کے سوا اور کوئی نہ تسلیم کیا جائے اور انفرادی و اجتماعی زندگی صرف اللہ کے حدود کی پابند ہو اور حکومت وہ قائم ہو جو اللہ کے سامنے جواب دہ ہو۔ اسی کا نام دینِ اللہ ہے۔

لیکن اس نصب العین تک پہنچنے کے لیے آپ راستہ کیا اختیار کرتے ہیں؟ یہ کہ پہلے مالک الملک انگریز کے بجائے خود باشندگان ملک قرار پائیں، انفرادی و اجتماعی زندگی پر حدود انگریز کے بجائے حدود جمہور کا تسلط قائم ہو اور حکومت برٹش پارلیمنٹ کے بجائے جمہور کے سامنے جواب دہ ہو، یعنی دوسرے الفاظ میں دین انگریز کی جگہ دین جمہور قائم ہو جائے۔ یہ دین جب زمین میں جڑ پکڑ لے گا تب آپ دین اللہ کو قائم کرنے کی جدوجہد شروع کرینگے۔ سوال یہ ہے کہ مکہ جانے کے لیے آخر یہ ٹوکیو کا راستہ اختیار کرنے کی ضرورت جناب کو کس لیے پیش آئی؟ کونسی چیز آپکو براہ راست مکہ کی طرف پیش قدمی کرنے سے روکتی ہے کہ پہلے آپ ٹوکیو تشریف لے جائینگے اور پھر وہاں سے مکہ کا قصد فرمائینگے؟ یہ ظاہر ہے کہ دین جمہور صرف اسی صورت میں دین انگریز کو ہٹا کر اسکی جگہ لے سکتا ہے جبکہ عوام الناس کے ذہن میں خود اپنے مالک الملک ہونے کا عقیدہ اور عملاً مالک الملک بن جانے کا ارادہ شدت کے ساتھ جڑ پکڑ لے۔ بخلاف اس کے دین اللہ صرف اس صورت میں قائم ہو سکتا ہے جبکہ عوام الناس ہر دوسرے کی حاکمیت تسلیم کرنے سے بھی انکار کریں، خود اپنی حاکمیت کے دعوے سے بھی دست بردار ہو جائیں، اور صرف اللہ کی حاکمیت کے آگے برضا و رغبت سر جھکا دیں۔ اب ایک ذی عقل آدمی، جس کے ہوش و حواس درست ہوں، کس طرح اس حماقت کا ارتکاب کر سکتا ہے کہ اس کا مقصد اصلی تو ہو دین اللہ کا قیام، اور اسکے لیے عملی تدبیر وہ یہ اختیار کرے کہ پہلے عوام الناس کے دل و دماغ پر خود اپنی حاکمیت کا عقیدہ اور ارادہ اتنی قوت کے ساتھ بٹھا دے کہ دین انگریز کی جڑیں اسکے زور سے اکھڑ جائیں اور دین جمہور کی جڑیں زمین میں جگہ پکڑ لیں؟ آخر دین اللہ کے نقطۂ نظر سے انگریز کی حاکمیت اور خود باشندگان ملک کی حاکمیت کے درمیان کیا فرق اور کیا وجہ ترجیح ہے؟ آخر کس معنی میں حاکمیت انگریز کی جگہ حاکمیت جمہور کا تمکن دین اللہ کے تمکن میں مددگار ہو سکتا ہے؟ اور وہ شخص جو درحقیقت پوری سچائی کے ساتھ اللہ کے مالک الملک ہونے پر ایمان رکھتا ہو آخر کس دل سے یہ گوارا کر سکتا ہے کہ اپنے ایمان کے خلاف عوام الناس میں خود اپنے مالک الملک ہونے کا عقیدہ پھیلاتا پھرے؟

باقی صفحہ ۳۹۹

بقیہ صـــ ۱۶ :- کس طرح ایک سچے آدمی کی زبان ایسے عقیدہ کی حمایت میں کھل سکتی ہے جس کو وہ فی الواقع باطل سمجھتا ہے ؟ اور کس طرح وہ اُس چیز کے قیام کی راہ میں جان و مال سے جہاد کر سکتا ہے جو اسکے اعتقاد میں حق نہیں بلکہ طاغوت ہے ؟ ان سوالات کا جواب پبلک میں تو بہت سیدھے لنگڑے لُولے عذرات کے ساتھ دیا جاتا ہے مگر پرائیویٹ صحبتوں میں صاف اقرار کر لیا جاتا ہے کہ دراصل اِس راہ پر ہم اسلیے چل رہے ہیں کہ دین حق کے قیام کی راہ میں اس وقت بے حد مشکلات حائل ہیں - یہ وہی بات ہے جسکی طرف میں اوپر اشارہ کر چکا ہوں کہ ان لوگوں نے نہ تو مشکلات کی نوعیت کو سمجھا، نہ ان کو دور کرنے کی فکر کی، بس سرسری نظر میں صرف یہ دیکھ لیا کہ مشکلات حائل ہیں اور پھر ان سے دہشت زدہ ہو کر ایک غلط راہ پر چل پڑے۔

ایک اور گروہ نے تیسری راہ فرار اختیار کی ہے اور وہ پاکستان اسکیم کے نام سے مشہور ہے۔ یہ اسکیم دراصل ان لوگوں کے دماغ کی پیداوار ہے جنکے ذہن کی ساری تربیت مغربی اثرات کے تحت ہوئی ہے اور جنہوں نے تمدن و سیاست کے متعلق تمام تصورات یورپ کی تاریخ اور علوم عمران سے سیکھے ہیں - ایک مدت دراز تک تو ان لوگوں کی سمجھ میں یہی بات نہ آئی کہ انگریزوں نے ہندوستان کو ایک قوم فرض کر کے یہاں جو جمہوری دستور نافذ کیا ہے اس میں بنیادی غلطی کیا ہے - یہ اپنے آپ کو واقعی ہندوستانی قوم کا ایک جزء تسلیم کرتے رہے اور انکی تمام تر کوششیں صرف اس حد تک محدود رہیں کہ اس قومیت کی بنیاد پر جو جمہوری نظام بنایا جا رہا ہے اس میں اپنے لیے کوئی مناسب جگہ تلاش کریں - مگر جب کسی طرح چُول سیدھی نہ بیٹھی تو بمشکل انکی سمجھ میں یہ بات آئی کہ ہم کسی وطنی قومیت کے جزء نہیں ہیں بلکہ خود ایک مستقل قوم ہیں - لیکن "قوم" کے لفظ نے پھر انہیں دھوکا دیا - اس لفظ سے ان کا تعارف یورپین لٹریچر ہی کے واسطہ سے ہوا تھا، اسلیے یہ سمجھے کہ ہم بھی ویسی ہی ایک قوم ہیں جیسی دنیا میں دوسری قومیں ہوا کرتی ہیں، اور چونکہ یہاں ہماری تعداد کم ہے لہذا ہم ایک قومی اقلیت ہیں اور ہمارے مسائل

اُسی نوعیت کے ہیں جیسے دنیا میں قومی اقلیتوں کے ہوا کرتے ہیں۔ کچھ مدت تک اِس تصور کے تحت "مسائل قومی" حل کرنے پر وقت ضائع کیا جاتا رہا۔ آخر کار جب یہاں بھی کوئی راہ نجات نظر نہ آئی اور معلوم ہوا کہ جمہوری اصولوں کے اندر قومی اقلیتوں کے لیے زندگی کی کوئی سبیل نہیں ہے، تو اِن کا ذہن اِس طرف منتقل ہوا کہ ہندوستان کے بعض حصوں میں ہماری اکثریت بھی تو ہے، پھر کیوں نہ ہندوستان کے دو ٹکڑے کر دیے جائیں، جس ٹکڑے میں ہماری اکثریت ہے وہاں ہماری قومی حکومت قائم ہو اور دوسرے قومی اقلیت قرار پائیں، اور جہاں دوسروں کی اکثریت ہے وہاں اُنکی قومی حکومت ہو اور ہم قومی اقلیت کی حیثیت سے رہیں ——— یہ اس پاکستانی تخیل کے ارتقاء کی مختصر تاریخ ہے۔ اور یہ تاریخ خود شاہد ہے کہ نقطۂ آغاز سے لیکر نقطۂ انجام تک ہر مرحلہ میں یہ تخیل مغربی تصوراتِ قومیت کے زیر اثر پرورش پاتا رہا ہے۔ مگر آخری مرحلہ پر پہنچ کر یکایک اس میں اسلامی نصب العین کا جوڑ لگا دیا جاتا ہے اور ہم سے کہا جاتا ہے کہ جب جمہوری اصول پر (یعنی اس اصول پر کہ باشندگان ملک خود مالک الملک ہیں) پاکستان میں "مسلمانوں" کی اکثریت کا اقتدار قائم ہو جائیگا تب ہم رفتہ رفتہ نظام حکومت کو تبدیل کر کے اسلامی اصول پر ڈھال دینگے۔

اس تخیل میں پہلی بنیادی غلطی یہ ہے کہ طرز فکر اور طریق عمل تو ہے سراسر غیر اسلامی، مگر نام بار بار لیا جاتا ہے اسلام اور مسلمان کا۔ بلاشبہ اسلام اپنے پیروؤں کو ایک مستقل "امت" بناتا ہے، ایسی امت جو کسی دوسری قومیت میں بحیثیت ایک جزء کے شامل نہیں رہ سکتی، مگر یہ امت اُس چیز سے بالکل مختلف نوعیت کی ہے جس پر مغربی علوم اجتماع میں لفظ "نیشن" کا اطلاق کیا جاتا ہے، اور اسی طرح اسکے مسائل اور اسکے مقاصد بھی اُس سے بالکل مختلف ہیں۔ مغربی قومیت کسی عقیدے اور کسی اخلاقی نصب العین کی بنیاد پر نہیں بنتی بلکہ تاریخی تعصبات اور موروثی تہذیب و تمدن سے بنتی ہے۔ اس کے

پاس کسی قسم کے اصول حق نہیں ہوتے جنہیں پیش کرکے وہ دوسروں کو اپنے ساتھ شریک ہونے کی دعوت دے سکے بلکہ وہ محض اپنے چند تعصبات رکھتی ہے جو ناقابلِ تبلیغ شے ہیں۔ اسکے سامنے کوئی اخلاقی مقصد بھی نہیں ہوتا بلکہ صرف یہ مقصد ہوتا ہے کہ اپنی قومی انفرادیت کا تحفظ کرے اور جو لوگ اس قوم میں پیدا ہوئے ہیں اُنکے دنیوی مفاد کے لیے جدوجہد کرے۔ اسی وجہ سے اس قومیت کے لیے کثرت و قلت کا سوال پیدا ہوتا ہے، اسی وجہ سے دوسری قوموں کے ساتھ دنیوی مفاد کے لیے اُسکی کشمکش ہوتی ہے، اسی وجہ سے وہ چاہتی ہے کہ جہاں اسکی کثرت ہو وہاں اسکی قومی حکومت قائم ہو جائے اور جہاں اُسکی قلت ہو وہاں اسکے لیے دستوری تحفظات کا انتظام کیا جائے۔ لیکن اسلام جو امت بناتا ہے اُسکی سرے سے یہ حیثیت ہے ہی نہیں۔ یہ امت صرف اس وجہ سے بنتی ہے کہ اسلام تمام انسانی قوموں کے سامنے ایک عقیدہ اور ایک ضابطۂ زندگی پیش کرتا ہے اور جو لوگ اس کو قبول کر لیتے ہیں وہ ایک امت بن جاتے ہیں۔ اس امت کا کوئی مقصد اسکے سوا نہیں ہے کہ اسلام کے عقیدے اور ضابطہ کی بنیاد پر اجتماعی زندگی کی عمارت تعمیر کرنے کے لیے جدوجہد کرے۔ اسکے لیے کثرت اور قلت کا کوئی سوال نہیں۔ یہ ایک کی اقلیت سے شروع ہوتی ہے اور سو فی صدی اکثریت تک پہنچ سکتی ہے۔ جس طرح تمام قوموں سے نکل نکل کر لوگ اب تک اس امت میں آتے رہے ہیں اسی طرح آئندہ بھی آسکتے ہیں۔ اس کا کام دنیا کی دوسری قوموں سے اپنے دنیوی مفاد کے لیے لڑنا نہیں ہے۔ بلکہ انہیں اپنے اصولِ حق اور اپنے اخلاقی نصب العین کی طرف دعوت دینا ہے۔ اسکے دعوے کی بنیاد یہ نہیں ہے کہ یہاں ہم ۶۵ یا ۷۰ فی صدی ہیں اس لیے یہاں ہماری حکومت ہونی چاہیے، بلکہ اسکے دعوے کی بنیاد یہ ہے کہ یہ اصولِ حق ہیں جن پر تمدن و سیاست و اخلاق کا نظام تعمیر ہونا انسانی فلاح و سعادت کا واحد ذریعہ ہے لہذا تمام دنیا کو ہم انکی طرف دعوت دیتے ہیں اور جس سرزمین کے لوگ بھی ان پر راضی ہو جائیں وہاں ہم ان اصولوں کی حکومت قائم کرینگے خواہ وہ جمنا اور اٹک کے درمیان واقع ہو یا نربدا اور گنگا کے درمیان یا قطب شمالی و جنوبی کے درمیان۔ اب ہر وہ شخص جو ذرہ برابر بھی حقائق میں بصیرت رکھتا ہو، علانیہ یہ دیکھ سکتا ہے کہ اسلامی امت کی اس حیثیت میں اور پاکستانی تخیل

کے بانیوں اور حامیوں کی اُس حیثیت میں جو اوپر بیان ہوئی بعد المشرقین ہے۔ اگر یہ لوگ واقعی اسلامی امت ہیں تو ان کا سارا مقدمہ ہی بے بنیاد اور سراسر غلط ہے۔ اور اگر انکے مقدمہ کی حقیقی صورت نوعیت یہی ہے تو انکو اسلام اور اسلامی امت کے نام سے یہ مقدمہ پیش کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ایسا مقدمہ لے کر اُٹھنے والوں کو اپنی قومیت کا کوئی دوسرا نام تجویز کرنا چاہیے۔

دوسری عظیم الشان غلطی اس تخیل میں یہ ہے کہ یہ لوگ "پاکستان" تک ناپاکستان کے راستہ سے پہنچنا چاہتے ہیں۔ اِن سے جب پوچھا جاتا ہے کہ پاکستان سے تمہاری مراد کیا ہے؟ تو کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک پاکستان وہ ہے جہاں حاکمیت صرف اللہ کی ہو اور جو انسان کی حاکمیت سے پاک ہو۔ پھر جب ان سے سوال کیا جاتا ہے کہ یہ پاکی و طہارت محض شمالی مغربی ہندوستان اور بنگال کے لیے آپ نے کیوں مختص فرمادی؟ باقی ماندہ ہندوستان کے بارے میں کیا تصور کیا ہے کہ اسکو آپ "پاکستان" بنانے سے منہ موڑتے ہیں؟ تو اس کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ اِن علاقوں میں اُن لوگوں کی (یعنی مسلمانوں کی) اکثریت ہے جو اللہ کی حاکمیت پر پہلے ہی ایمان رکھتے ہیں۔ لہذا پہلے ہم یہاں پاکستان بنائینگے اور پھر ہندوستان کے دوسرے حصوں کو اسی پاکی و طہارت کی طرف دعوت دینگے ـــــ اس سوال و جواب سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا شمالی مغربی ہندوستان اور مشرقی ہندوستان کی اکثر آبادی اللہ کی حاکمیت قبول کرنے کے لیے تیار ہے۔ مگر جب ہم انکی اسکیم کی تفصیلات دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ پہلے یہ اِن علاقوں میں مغربی ڈیموکریسی کے اصول پر اکثریت کی حکومت (یعنی وہی ناپاکستان) قائم کرینگے، پھر کہیں پاکستان کے لیے زمین تیار کرنے کی نوبت آئیگی۔ سوال یہ ہے کہ اگر یہ علاقہ واقعی حکومت الٰہی کے لیے تیار ہے، جیسا کہ آپ نے پہلے فرض کیا تھا تو قومی جمہوریت کی ناپاکی میں سے ہو کر جانے کے بجائے آپ براہِ راست الٰہی حکومت کی طرف ہی اقدام کیوں نہیں فرماتے؟ اور اگر یہ بھی اُسی طرح تیار کیے جانے کا محتاج ہے جس طرح باقی ہندوستان ہے تو پھر سارے

ہندوستان کو دنیا کو پاکستان بنانے کے لیے ایک اصولی دعوت لے کر اٹھنے کے بجائے آپ نے نام نہاد مسلم اکثریت کے صوبوں کو اپنا ہدفِ مقصود کیوں بنا لیا ہے؟ ان صوبوں میں جمہوری حکومت کا قیام آخر کس معنی میں حکومت الٰہیہ کے قیام کا ذریعہ بن سکتا ہے؟ ایران، ٹرکی، عراق غیر ممالک میں تو ایسے ہی نسلی مسلمانوں کو قومی جمہوریت اس وقت حاصل ہے۔ پھر کیا وہاں حکومت الٰہیہ کے لیے جدوجہد کرنا اس سے کچھ کم مشکل اور کم خطرناک ہے جتنا کسی کافر حکومت میں ہو سکتا ہے؟

یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ جہاں عوام الناس خدا کے بجائے اپنی اغراض نفسانی کے بندے بنے ہوئے ہوں، اور جہاں لوگ اپنی خواہشاتِ نفس سے دست بردار ہو کر خدا کے آگے بالکل سرِ تسلیم خم کر دینے پر آمادہ نہ ہوں، خواہ ایسی آبادی کا نام اصطلاحاً مسلمان ہو یا غیر مسلم، بہرحال ایسی جگہ جمہوری اصول پر جو لوگ برسرِ اقتدار آئینگے وہ خدا کے مطیع بندے تو نہیں ہونگے ـــــ ناپاک دودھ میں سے جو مکھن نکلے گا، لامحالہ وہ خالصۃً نجاست ہی ہوگا ـــــ اور ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں اقتدار کا آنا طبعاً و لازماً حکومت الٰہیہ کے قیام کے لیے کسی طرح مددگار نہیں ہو سکتا۔ الٰہی حکومت تو صرف اسی حالت میں قائم ہو سکتی ہے جبکہ ایک خالص اسلامی تحریک کے ذریعہ سے عوام الناس کے اخلاقی نقطۂ نظر کو بالکلیہ تبدیل کر دیا جائے۔ اور یہ تحریک جہاں بھی اٹھیگی ہر باغی حکومت اسکے لیے یکساں مزاحم ثابت ہوگی خواہ اُسکے حکمراں کھلے کافر ہوں یا نام کے مسلمان۔ پھر جب ہمیں ایک خالص اصولی تحریک کے ذریعہ سے عوام الناس میں خدا پرستانہ ذہنیت و اخلاق پیدا کرنا ہی ہے اور تمام حاضر الوقت نظامات سیاسی کے علی الرغم کرنا ہے، تو ہم پیدائشی مسلمان اور پیدائشی غیر مسلم سب کے پاس ایک ہی ساتھ کیوں نہ جائیں؟ کیوں ہم اسکو مسلمانوں کی آبائی جائداد سمجھ کر انہی میں تقسیم کرنے کی فکر کریں؟ اور کیوں ہم خواہ مخواہ پہلے ایک جغرافی حد بندی قائم کر کے اپنی تحریک کو محدود کر لیں؟ کیوں نہ ہم ان تمام لوگوں تک اپنی آواز پہنچائیں جنکو ہم اپنی بات سمجھا سکتے ہیں؟ غیر اللہ کی بندگی سے آزاد ہو کر صرف اللہ کا بندہ بن جانا تو ایک نعمت ہے

جو تمام انسانوں کے سامنے پیش کی جانی چاہیے۔ اگر نسلی مسلمان سب سے آگے بڑھ کر اس نعمت کو حاصل کرلیں تو چشم ما روشن دلِ ما شاد۔ لیکن اگر دعوت عام میں یہ پیچھے رہ جائیں اور دوسرے پیش قدمی کرکے اسے لینے کے لیے تیار ہو جائیں تو کیوں نہ "پاکستان" پہلے انہی کے درمیان قائم کیا جائے۔

یہ باتیں جب پاکستانی حضرات کے سامنے عرض کی جاتی ہیں تو وہ بھی اپنی مشکلات کی داستان بیان کرنی شروع کر دیتے ہیں جن سے خوف زدہ ہو کر بعض لوگوں نے ہندوستانی وطن پرستوں کے ساتھ میل کیا ہے اور بعض دوسرے لوگوں نے اسلام کو اجزاء میں تقسیم کرکے چند اجزاء لینے اور چند کو چھوڑ دینے کی تدبیریں سوچنی شروع کی ہیں۔ کہتے ہیں کہ صاحب! اسلام کے خلاف تو ہندو، سکھ، پارسی، عیسائی، تمام قوموں میں سخت تعصبات پھیلے ہوئے ہیں، بھلا اس حالت میں اسلام ایک خالص اصولی تحریک کی حیثیت سے کہاں چل سکتا ہے۔ حالانکہ یہ واقعات کو غلط رنگ میں دیکھنا اور غلط نتائج نکالنا ہے۔ بے شک تعصبات موجود ہیں، مگر وہ اسلام اور اسلامی سیرت کے بھڑکائے ہوئے نہیں ہیں (جس سے ان قوموں کو ہندوستان میں کم ہی سابقہ پیش آیا ہے) بلکہ اسلام کے ان غلط نمائندوں کی روش سے پیدا ہوئے ہیں جو مسلمان ہونے کے باوجود غیر اسلامی طریقوں پر چلتے رہے اور خالصتہً للہ کام کرنے کے بجائے اپنی دنیوی اغراض اور نفسانی خواہشات کے لیے کام کرتے رہے۔ لہٰذا ان تعصبات کا صحیح علاج یہ ہے کہ اب اپنی سیرت، اپنے اعمال اور اپنی اجتماعی جد و جہد سے اسلام کی صحیح نمائندگی کیجیے، نہ یہ کہ تعصبات کی موجودگی کو اسی غلط روش پر چلنے کے لیے حجت بنائیے جس کی وجہ سے تعصبات پیدا ہوئے ہیں۔ بالفرض اگر یہ مان لیا جائے کہ قومی تعصبات کی موجودگی میں اسلام کا ایک خالص اصولی تحریک کی حیثیت سے چلنا محال ہے، تو سوال یہ ہے کہ اسلامی مقاصد کے بجائے مسلمانوں کے دنیوی مفاد کے لیے جو کشمکش آپ کے اور دوسری قوموں کے درمیان برپا ہے اور ان کی قوم پرستانہ طریقوں کے جواب میں ویسے ہی قوم پرستانہ طریقے جس طرح آپ اختیار کر رہے ہیں، کیا اس سے یہ تعصبات کبھی قیامت تک بھی دور ہو سکتے ہیں؟ اگر نہیں، تو پھر یہ نہ کہیے کہ اس وقت کچھ خاص حالات ایسے ہیں جن کی وجہ سے اسلام ایک خالص اصولی

تحریک کی حیثیت سے نہیں چل سکتا، بلکہ یوں فرمائیے کہ آئندہ بھی ہمیشہ ایسے ہی حالات موجود رہینگے اور اگر اسلام آپ ہی کا ورثۂ آبائی بنا رہا تو وہ ہمیشہ بنی اسرائیل کی طرح محض آپکا قومی مذہب بنکر رہیگا، کبھی ایک عالمگیر دعوت نہ بن سکیگا۔

پس یہ ایک حقیقت ہے کہ اسوقت جو لوگ نیک نیت ہونے کے باوجود براہِ راست حق کی طرف پیش قدمی کرنے سے جھجک رہے ہیں اور پھیر کے راستوں پر چلے جا رہے ہیں، اُن سب کی غلط روی کا مشترک سبب ایک ہی ہے کہ وہ اسلامی تحریک کی راہ میں مشکلات کے پہاڑ حائل دیکھ کر راستہ کترانے کی کوشش کرتے ہیں مگر خود ان پہاڑوں کا جائزہ لے کر نہیں دیکھتے کہ یہ پہاڑ ہیں کس قسم کے۔ حالانکہ تحقیق کرنے سے ان پہاڑوں کی حقیقت بآسانی معلوم کی جا سکتی ہے۔ پہلے اسلام کے اصولوں کو دیکھیے کیا بجائے خود انکے اندر ایسی کوئی خرابی ہے کہ انسان بالعموم اس دین کو قبول نہ کر سکتے ہوں اور یہ صرف ایک خاص قوم کا مسلک بنکر ہی رہ سکتا ہو؟ اگر یہ بات نہیں ہے اور ہرگز نہیں ہے تو پھر انسانوں پر نگاہ ڈالیے، کیا آج اُن میں کوئی ایسی غیر معمولی خاصیت پیدا ہو گئی ہے جو پہلے زمانے کے انسانوں میں نہ تھی اور جسکی وجہ سے اب ان کا اسلامی تحریک سے متاثر ہونا غیر ممکن ہو گیا ہے؟ کیا نفسِ انسانیت کی ترکیب اور اسکے مزاج میں اب کوئی تغیر آ گیا ہے؟ کیا اللہ نے اب دنیا میں کسی نئے ماڈل کے انسان بنانے شروع کر دیے ہیں کہ ان میں صرف ابوجہل اور ابولہب ہی پائے جا سکتے ہیں، ابوبکر صدیق، عمر فاروق، سلمان فارسی اور بلال حبشی نہیں پائے جا سکتے؟ اگر یہ بات بھی نہیں تو پھر اس امر میں کوئی شک باقی نہیں رہ جاتا کہ یہ ساری مشکلات جو اسلامی تحریک کی راہ میں سدِّ سکندری بنی نظر آ رہی ہیں، اسلام کے پیروؤں کی پیدا کردہ ہیں۔ اُنکی کسی کمزوری اور کسی غلط روش نے انہیں پیدا کیا ہے۔ اور جب ان مشکلات کی حقیقت یہ ہے تو صحیح طریقہ یہ نہیں ہے کہ مشکلات سے بچنے کے لیے سیدھا راستہ چھوڑ کر پھیر کے راستوں سے نکلنے کی کوشش کی جائے، بلکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس غلطی کی اصلاح اور اُس کمزوری کا علاج کیا جائے جسکی وجہ سے یہ صورت حال رونما ہوئی ہے۔

اس بحث کی ابتدا میں ان مشکلات کا جو تجزیہ میں نے کیا ہے اُس پر ایک نظر ڈالنے سے صاف معلوم کیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی روش میں کس قسم کی اصلاح مطلوب ہے۔ ہم جب اپنے آپکو مسلمان کہتے ہیں تو

دراصل یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نفس پرست یا دنیا پرست نہیں بلکہ خدا پرست ہیں۔ ہمارے اس دعوے کا ثبوت ہماری زندگی سے ملنا چاہیے۔ اللہ رب العالمین پر ایمان لانے کے بعد ہماری حیثیت اُن انسانوں کی سی نہیں رہتی جو اللہ کے بجائے اپنے نفس کی خواہشات پر، یا اپنی دنیوی اغراض پر، یا اپنی قوم اور اپنے ملک پر ایمان لاتے ہیں۔ لہٰذا ہم وہ سب کچھ کرنے کے لیے آزاد نہیں ہیں جو وہ کرتے ہیں، اور نہ ہم کو جاہلیت کے وہ طریقے زیب دیتے ہیں جو اُن کے لیے خوشنما اور مزین ہیں۔ ہم دنیا میں عدل و قسط کا نظام قائم کرنے پر مامور ہیں، ہمارے سپرد دنیا کو خیر و صلاح کی طرف دعوت دینے اور شر و فساد کا خاتمہ کرنے کی خدمت کی گئی ہے، ہمیں اپنے مفاد یا کسی خاص قوم کے مفاد کی خدمت کے لیے نہیں اٹھایا گیا بلکہ انسانیت عامہ کی فلاح و سعادت کے لیے اٹھایا گیا ہے۔ ہمارا یہ کام نہیں ہے کہ چھوٹے چھوٹے دنیوی فائدوں کے لیے دوسری قوموں سے جھگڑے کریں۔ نہ قوم پرستانہ تنگ نظری اور اسکے ذلیل ہتھکنڈے اور اسکے مایۂ شر و فساد قضیے ہمارے لیے موزوں ہیں۔ اور نہ ہم کو یہ مناسب ہے کہ اُن ادنیٰ درجہ کے مقاصد کے لیے جدوجہد کریں جنہیں اسلام نے ہماری کوششوں کا مقصود نہیں ٹھیرایا ہے۔ ہمیں اپنے دل کو تمام نفسانی محبتوں اور عداوتوں سے، تمام تعصبات سے اور تمام دنیوی اغراض سے پاک کر لینا چاہیے۔ دوسروں کے دل خواہ کتنے ہی تنگ ہوں، ہمارے دل فراخ ہونے چاہییں۔ دوسروں کی نظر خواہ کتنی ہی پست ہو، ہماری نظر بلند ہونی چاہیے۔ دوسرے اپنی شخصی یا قومی اغراض کے لیے خواہ کتنی ہی تگ و دو کریں، ہمیں انکی پیروی نہ کرنی چاہیے۔ اُنکے برعکس ہم کو تو اپنے دل سے یہ خیال بالکل نکال ہی دینا چاہیے کہ کسی غیر الٰہی نظام تمدن و سیاست میں بھی ہمارا کوئی شخصی یا قومی مفاد ہو سکتا ہے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے تو دراصل ہمارا کوئی مفاد اسکے سوا ہے ہی نہیں کہ یہ غلط نظام زندگی من حیث الکل فنا ہو جائے اور اسکی جگہ اُن اصولِ حق پر اجتماعی زندگی کی تعمیر ہو جنکی تعلیم خدا نے پیغمبروں کے ذریعہ سے نوع انسان کو دی ہے۔ اسی مفاد پر ہم کو اپنی تمام توجہات مرکوز کر دینی چاہییں اور ہر دوسرے مفاد کو ٹھوکر مار دینی چاہیے۔ یہ روش جب ہم اختیار کرینگے اور جب ہمارے اقوال و افعال انفرادی و اجتماعی حیثیت سے اسی روش کے مطابق ہونگے اور متناقض باتوں سے ہمارا طرزِ عمل پاک ہوگا تب ہمارے گرد و پیش کے لوگ ہمارے خلوص نیت سے مغلوب و متاثر ہونے لگینگے اور تب ہی ہماری دعوت الی الخیر انکے دلوں تک نفوذ کریگی۔ محض کتابوں میں لکھا ہوا حق کم

ہی لوگوں کو مسخر کرتا ہے۔ مگر جب حق پرستوں کی ایک جماعت اُسکی پشت پر موجود ہو اور لوگ اُس جماعت کی زندگی میں عیاناً حق کا مشاہدہ کرلیں تو آبادیوں کی آبادیاں اسکے آگے سپر ڈالتی چلی جاتی ہیں۔

یہ روش اختیار کرنے کا جب مشورہ دیا جاتا ہے تو دو شکوک اور پیش کیے جاتے ہیں۔

ایک یہ کہ تمام نسلی مسلمانوں کے اخلاقی نقطۂ نظر، انکی عملی زندگی، اور اُنکے اجتماعی رویہ میں اتنا بڑا تغیر آنا فاناً تو نہیں ہوسکتا۔ اسکے لیے مدت دراز درکار ہے۔ اور جبتک یہ سب کے سب بدل جائیں وہ پالیسی نہیں چل سکتی جو تم تجویز کررہے ہو۔

دوسرے یہ کہ اگر مسلمان اس روش کو اختیار کر بھی لیں تو آخر اُنکے سیاسی و معاشی مفادات کا کیا حشر ہوگا۔ ایک طرف دوسری قومیں پوری ہوشیاری کے ساتھ زیادہ سے زیادہ فائدے سمیٹنے میں لگی ہوئی ہوں اور دوسری طرف ہم اپنے مفاد کی فکر سے بے پروا ہو کر خالص حق پرستی میں مشغول ہوں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم دیکھتے دیکھتے زمین سے بے دخل ہو جائینگے اور صرف ہوا میں ہمارا ٹھکانا رہ جائیگا۔

یہ دونوں شبہے جن اصحاب کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں اُنکے دلوں کی اصلی بیماری یہ ہے کہ وہ اس روش کو ایک چال یا پالیسی سمجھ کر اس حیثیت سے جانچنا چاہتے ہیں کہ یہ کارگر کہاں تک ہوسکتی ہے۔ یعنی اگر کارگر ہو اور بے خطر بھی ہو تو اسے اختیار کیا جائے ورنہ کوئی دوسرا ڈھنگ تلاش کیا جائے۔ حالانکہ میں اس روش کا مشورہ پالیسی کی حیثیت سے نہیں بلکہ حق ہونے کی حیثیت سے دے رہا ہوں۔ تمام انبیاء علیہم السلام اور تمام صالحین اسی روش پر چلے ہیں۔ یہی طریق حق ہے۔ اسکے سوا کوئی دوسرا برحق طرز عمل ہے نہیں کہ دونوں کے درمیان اختیار و انتخاب کا سوال پیدا ہو۔ لہذا اہل ایمان کو منفعت پرستانہ ذہنیت کے ساتھ یوں نہیں سوچنا چاہیے کہ اس راہ سے کام بنتا ہے تو اس پر چلیں ورنہ کوئی دوسری راہ نکالیں۔ بلکہ اس نظر سے دیکھنا چاہئے کہ ہمارے لیے اسکے سوا کوئی دوسرا چارۂ کار ہے نہیں۔ پھر جب اپنی ذہنیت کی اصلاح کرلیں تو انکے دونوں شبہوں کا مختصر جواب یہ ہے:

(۱) تمام مسلمانوں کے اخلاق، اعمال اور اجتماعی رویہ میں تغیر آنیکا انتظار کرنیکی کوئی حاجت نہیں۔ کَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً

مَنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ۔ جس جس کا قلب شہادت دیتا جائے کہ طریق حق یہ ہے وہ اپنی روش کی اصلاح کرے اور اپنی سعی جہد کا محور اپنے یا اپنی قوم کے دنیوی مفاد کے بجائے جہاد فی سبیل اللہ کو بنائے۔ پھر اسکو لازم ہے کہ اپنے گردوپیش کے انسانوں کو (مسلمانوں کو بھی اور غیر مسلموں کو بھی) خیر کی طرف دعوت دے۔ اور جو اس دعوت کو قبول کرے اُسے اس جہاد میں اپنا رفیق سمجھے۔

(۲) کوئی فرد ہو یا جماعت یا قوم، بہرحال اسے اگر کسی بڑے مقصد کے لیے جدوجہد کرنی ہے تو لامحالہ اسے اپنے چھوٹے چھوٹے فائدوں کی قربانی گوارا کرنی ہی پڑیگی۔ دنیا میں کوئی بڑی چیز چھوٹی چیزوں کی قربانی کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔ لہذا اگر زمین پر خدا کی بادشاہی کسی کی نگاہ میں بڑا مقصد ہو تو اسکی نگاہ میں تمام سیاسی معاشی مفادات چھوٹی چیزیں ہونے چاہییں اور اسے ہر دنیوی نقصان برداشت کرنے کے لیے تیار ہوجانا چاہیے۔ اور اگر اسکے نزدیک یہ فائدے بڑی چیزیں ہیں اور اس مقصد کی بہ نسبت عزیز تر ہیں تو پھر بہتر یہی ہے کہ وہ اس مقصد کا نام ہی نہ لے۔ نہ یہ مقصد ایسے لوگوں کے لیے ہے اور نہ ایسے لوگ اس مقصد کے لیے۔

موجودہ سیاسی مسائل کے باب میں جو کچھ مجھے مسلمانوں سے کہنا تھا، اب میں قریب قریب سب کہہ چکا ہوں لیکن اب تک یہ خیالات چونکہ منتشر طور پر شائع ہوتے رہے ہیں اسلیے بکثرت لوگ میرا نقطۂ نظر پوری طرح سمجھنے سے قاصر رہے ہیں۔ عموماً یہی ہوا کیا کہ کسی صاحب نے میرے ایک آدھ مضمون کو کہیں سے دیکھ لیا اور پھر طویل خط و کتابت یا لمبی چوڑی بحثوں میں اپنا بھی وقت ضائع کیا اور میرا بھی۔ اب یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ کے ان تمام مضامین کو جو پچھلے دو سال میں لکھے گئے ہیں ایک مجموعہ کی شکل میں مرتب کر دیا جائے، اور ترتیب دیتے وقت جہاں جہاں کوئی مضمون تشنہ رہ گیا ہو، یا کہیں کوئی شگاف کھلا رہ گیا ہو اُسکی تکمیل کردی جائے۔ اس طرح جب تمام پہلو ناظرین کے سامنے آجائینگے تو بیشتر غلط فہمیاں دور ہوجائینگی۔ امید ہے کہ آئندہ مہینے کے اختتام تک یہ مجموعہ ناظرین کو مل جائیگا، وباللہ التوفیق۔